مدارس کے حوالے سے حقیقت پسندانہ رویئے کی ضرورت

(ایک چشم کشا تحریر)

حافظ محمد اقبال جاوید

پاکستان میں مدارس کے حوالے سے ویسے تو ایک لمبے عرصے سے ایک بحث جاری ہے، لیکن اس بحث میں اضافہ 9 ستمبر 2001ء کے واقعے کے بعد دیکھنے میں آیا ہے۔ قیام پاکستان کے فوراً بعد مدارس کے نصاب میں اصلاح یا عصری مضامین کو شامل کرنے کے حوالے سے بحث و تمحیص کا جو سلسلہ شروع ہوا، اس کی نوعیت سیاسی سے زیادہ علمی تھی، اگرچہ اصلاح کی کوئی کوشش صحیح معنوں میں کامیابی سے ہمکنار نہ ہو سکی۔ میرے نزدیک اس کی بنیادی وجہ نوکر شاہی کی نااہلی، اس کا معاندانہ رویہ اور غیر موثر منصوبہ بندی تھی۔

لیکن 9 ستمبر 2001ء کے واقعے کے بعد مدارس کے حوالے سے جو بحث شروع کی گئی اس کی نوعیت علمی سے زیادہ سیاسی ہے۔ ملکی اور غیر ملکی ذرائع ابلاغ میں بڑی شدت سے یہ پروپیگنڈا کیا گیا کہ بالخصوص پاکستان کے مدارس دہشت گردی اور انتہا پسندی کے مراکز ہیں اور ان اداروں سے فارغ التحصیل طلباء مختلف ریاست مخالف سرگرمیوں میں مشغول ہیں۔ 16 دسمبر 2014ء کو پشاور کے فوجی اسکول میں دہشت گردی کا جو واقعہ رونما ہوا، اس کی شدت 16 دسمبر 1971ء کے سانحے سے کم نہیں تھی، چھوٹی بڑی عمر کے پھول جیسے 143 بچے اور اساتذہ نے جام شہادت نوش کیا۔ ان کا دکھ پوری قوم نے محسوس کیا جو لوگ خود اولاد جیسی نعمت سے واقف ہیں، انہیں معلوم ہے کہ چھوٹی عمر میں اپنی اولاد کو کھونا اور ان کے لاشے اٹھانا کتنا دردناک اور تکلیف دہ عمل ہے، اس واقعے کی شدت اور حدت کو محسوس کرتے ہوئے ہماری قیادت نے جو قومی لائحہ عمل ترتیب دیا، اس میں مساجد اور مدارس کا ذکر بھی ہوا۔ مورخہ 5 جنوری کو منعقدہ قومی اسمبلی کے اجلاس میں آرمی ایکٹ اور 1971ء کے آئین میں جو ترامیم تجویز کی گئیں، ان پر رائے شماری کو صرف اس لئے ملتوی

کرنا پڑا کہ اس پر بعض مذہبی جماعتوں کو کچھ اعتراضات تھے۔ مذہبی سیاسی جماعتوں کو ان ترامیم میں مذہب، مسجد یا فرقہ جیسے الفاظ کا اندراج قابل قبول نہ تھا، اگرچہ اگلے روز قومی اسمبلی اور اس کے فوراً بعد سینٹ نے مجوزہ ترمیمی بل منظور کرلیا، لیکن اس عمل میں تین سیاسی جماعتیں شریک نہ ہوئیں۔ یوں سانحہ پشاور کے نتیجے میں پیدا ہونے والی یکجہتی ہوا میں تحلیل ہوتی دکھائی دے رہی ہے، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ دہشت گردی اور انتہاپسندی کے خلاف اس وقت تک کامیابی نہیں ہوسکتی، جب تک ملک کی تمام سیاسی اور مذہبی جماعتیں متحد نہ ہوں۔ جب قومی لائحہ عمل کے اعلان کے وقت تمام مذہبی جماعتیں حکومت کے ساتھ متحد تھیں تو پھر آخر کیا وجہ ہے کہ آئینی ترامیم کے وقت ان کو ساتھ رکھنے کی حکمت عملی وضع نہیں کی گئی، کہیں ایسا تو نہیں کہ جیسے 2010ء میں اٹھارویں آئینی ترمیم کے وقت دو سیاسی جماعتوں نے بائیکاٹ کی دھمکی دے کر اپنی مرضی کے نکات شامل کرائے، اسی طرح آج بھی ایسی سیاسی جماعتیں اپنی مرضی کے مقاصد حاصل کرنا چاہتی ہوں، اگر ایسا ہے تو پھر نفع کی بجائے نقصان کا زیادہ احتمال ہے۔

پاکستانی معاشرہ آج جس صورت حال سے دوچار ہے۔ دہشت گردی کی کارروائیوں نے جس طرح پوری قوم کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا ہے، اس صورت حال کا تقاضا ہے کہ اس کے خلاف متفقہ لائحہ عمل اپنایا جائے اور تمام سیاسی اور مذہبی جماعتیں متحد ہو کر قوم کو اس تکلیف دہ صورت حال سے نجات دلائیں۔ ایسی ہی ایک کاوش وزارت مذہبی امور اور وفاقی وزارت تعلیم کی طرف سے کی گئی جب دونوں وزارتوں کے اعلیٰ حکام اور اتحاد تنظیمات مدارس کے نمائندوں کا ایک اجلاس 30 دسمبر کو اسلام آباد میں منعقد کیا گیا، جس میں وزیر مملکت برائے تعلیم انجینئر محمد بلیغ الرحمن، وزیر مذہبی امور جناب سردار محمد یوسف اور وزیر مملکت برائے مذہبی امور جناب پیر سید حسنات نے بھی شرکت کی۔ بدقسمتی سے ذرائع ابلاغ نے اس پیش رفت کی صحیح تصویر پیش نہیں کی۔ اس اجلاس میں شرکاء میں مدارس کے حوالے سے بیشتر امور پر اتفاق رائے پایا گیا۔

اس اجلاس میں اتحاد تنظیمات مدارس کے نمائندوں نے جہاں مدارس پر لگائے گئے انتہاپسندی اور دہشت گردی کے الزامات کی تردید کی، وہیں پر ان بہت سارے نکات پر عملدرآمد کے لئے رضامندی کا اظہار کیا جو وقتاً فوقتاً حکومت کی طرف سے پیش کئے جاتے ہیں، اس اجلاس میں موجود بہت سے شرکاء کے لئے یہ بات باعث حیرانی بھی تھی اور باعث پریشانی بھی کہ مدارس کے حوالے سے وزارت داخلہ اور اتحاد تنظیمات مدارس کے مابین اکتوبر 2010ء میں طے پانے والے معاہدے پر عملدرآمد کے لئے کوئی پیش رفت نہیں کی گئی۔ اتحاد تنظیمات مدارس کے نمائندوں کا یہ شکوہ تھا کہ ایک طرف سے تو خود حکومت کی طرف سے عرصہ دس سال مدارس کی رجسٹریشن پر پابندی رہی، اس وقت ہزاروں درخواستیں معرضِ التواء میں ہیں، لیکن دوسری طرف مدارس پر رجسٹریشن نہ کرانے کا الزام لگایا جاتا ہے، اسی طرح مختلف بینک بھی مدارس کے اکاؤنٹ کھولنے سے انکاری ہیں، جبکہ مدارس پر زور ڈالا جاتا ہے کہ وہ اپنے ذرائع آمدنی سے

حکومت کو آگاہ کریں، اگر مدارس کے اکاؤنٹ کھول دیئے جائیں تو ان کے ذرائع آمدنی خود بخود حکومت کے علم میں آجائیں گے، ان کا یہ بھی بجا طور پر صحیح مطالبہ تھا کہ مدارس کی طرح ملک میں کام کرنے والی ہزاروں غیر سرکاری تنظیموں کو بھی اپنے ذرائع آمدنی ظاہر کرنے کا پابند کیا جائے۔ خاص طور پر ایسی تنظیمیں جو غیر ملکی ایجنڈے کی تکمیل میں مصروف ہیں۔ ان کے بقول ایسی تنظیموں کو بعض حکومتی ادارے اور وزارتیں خود حفاظتی چھتری فراہم کرتی ہیں، اس اجلاس میں جہاں ایک طرف شرکاء نے وفاقی حکومت اور بالخصوص وزیر داخلہ چودھری نثار علی خان کے اس بیان کا خیر مقدم کیا کہ ملک کے بیشتر مدارس صحیح طور پر کام کررہے ہیں، صرف دس فیصد مدرسے ایسے ہیں جو دہشت گردی یا انتہا پسندی میں مصروف ہیں، وہیں پر ان نمائندوں نے اس بات کا شکوہ بھی کیا، دس فیصد مدارس کو دہشت گردی میں ملوث قرار دینے سے تمام مدارس کی حیثیت مشکوک ہو جاتی ہے۔ یہ بات تمام مدارس کے لئے اُلجھن اور خوف و ہراس کا باعث ہے۔ وفاقی حکومت کی طرف سے ان ممالک کی صحیح تعداد اور واضح نشاندہی ہونی چاہیے جو ایسی سرگرمیوں میں ملوث ہیں۔ صوبائی اور مرکزی حکومت کی خفیہ ایجنسیوں کی موجودگی میں ایسے مدارس کی نشاندہی کوئی مشکل کام نہیں ہے۔

ایک محتاط اندازے کے مطابق اس وقت ملک میں تقریباً 23000 مدارس کام کررہے ہیں۔ ان کا دس فیصد تیئس سو بنتا ہے۔ اگر ایک مدرسے میں اوسطاً پچاس طلباء بھی ہوں تو ایسے طلباء کی کل تعداد ایک لاکھ سے کہیں متجاوز ہے۔ یہ تعداد نا صرف قرین قیاس نہیں، بلکہ خلاف حقیقت بھی ہے۔ اس لئے ضرورت اس امر کی ہے کہ مدارس کے بارے میں ایک صحیح اور حقیقت پسندانہ رویہ اپنایا جائے۔ صحیح اعداد و شمار اور معروضی حالات کی روشنی میں ایک ٹھوس لائحہ عمل ترتیب دیا جائے۔ کچھ مدارس کے الفاظ سے تمام مدارس کے کردار پر حرف آتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ اتحاد تنظیمات مدارس کے نمائندگان اس بات پر صدق دل سے تیار ہیں کہ مدارس میں ابتدائی اور ثانوی سطح کے عصری مضامین متعارف کرائے جائیں، بلکہ بہت سارے مدارس میں یہ کام پہلے سے ہو رہا ہے۔ وزارت داخلہ اور اتحاد تنظیمات مدارس کے مابین 2010ء میں طے پانے والے معاہدے کی روشنی میں اس عمل کو آگے بڑھانے کی ضرورت ہے۔

تیسری اہم بات یہ کہ اس وقت مدارس کے معاملات دیکھنے کے لئے کم از کم تین وزارتیں کام کررہی ہیں۔ اس تقسیمِ کار سے نہ صرف مدارس مشکلات کا شکار ہیں، بلکہ خود حکومت کے لئے بھی کام کرنا مشکل دکھائی دیتا ہے، اس لئے اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ مدارس کے حوالے سے تمام تر ذمہ داریاں صرف ایک وزارت کے سپرد کی جائیں۔ ماہرین کے خیال میں اس کام کے لئے وزارت تعلیم زیادہ موزوں ہے، کیونکہ مدارس مذہبی ادارے نہیں ہیں، بلکہ مذہبی تعلیم کے ادارے ہیں اور حکومت کی خواہش یہ ہے کہ مدارس کے نصاب میں عصری مضامین شامل کئے جائیں۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ مدارس کے حوالے سے تمام ذمہ داری وزارت تعلیم کو تفویض کی جائے۔ چوتھی بات یہ کہ مدارس کو مرکزی دھارے میں لانے اور مدارس کے نصاب میں عصری علوم متعارف کرانے کے ساتھ ساتھ مدارس میں پڑھنے والے 30 لاکھ کے

قریب طلباء کو خواندگی اور شرح داخلہ کے شمار میں شامل کیا جائے۔ اس سے ایک تو بین الاقوامی سطح پر خواندگی کی ایک بہتر تصویر ابھرے گی اور دوسرا عصری مضامین کا تعارف آسان ہو جائے گا، اگر ملک بھر میں پھیلے غیر معیاری نجی اسکولوں سے ایجوکیشن فاؤنڈیشن کے توسط سے سرکاری رقومات تقسیم کی جا سکتی ہیں تو اس کار خیر میں ان مدارس کو شامل کیا جائے جو عصری مضامین اپنے نصاب میں شامل کرنے کے لئے تیار ہیں۔

جیسا کہ اوپر ذکر کیا کہ پاکستانی مدارس پر تنقید میں 9 ستمبر 2011ء کے واقعے کے بعد اضافہ دیکھنے میں آیا۔ اس واقعے کے بعد غیر ملکی ذرائع ابلاغ کی تقلید میں ملکی ذرائع ابلاغ میں بھی مدارس پر ایک بے جا تنقید اور بغیر ثبوت کے الزامات کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع کیا گیا، جس نے مدارس کے خلاف رائے عامہ ہموار کرنے کی کوشش کی۔ ستمبر 2001ء کے واقعے کا جائزہ لینے کے لئے امریکی حکومت نے جو کمیشن بنایا، اس کی رپورٹ 2004ء میں شائع ہوئی جو 9/11 کمیشن رپورٹ کہلاتی ہے۔ اس رپورٹ کے صفحہ 367 پر پاکستان کے حوالے سے جو تبصرہ درج ہے، اس کا ترجمہ کچھ یوں ہے:

''پاکستان کی دائمی غربت، وسیع پیمانے پر پھیلی کرپشن اور غیر مؤثر حکومتی نظام اسلام پرست افراد کی بھرتی کے مواقع فراہم کرتا ہے، لاکھوں خاندان، خاص طور پر غریب خاندان اپنے بچوں کو مدارس میں تعلیم دلانے پر مجبور ہیں۔ ایسے بہت سارے مذہبی تعلیمی ادارے غریب والدین کے بچوں کے لئے حصول تعلیم کا واحد ذریعہ ہیں، لیکن ان میں سے کچھ اداروں کو انتہا پسندانہ کارروائیوں کے مرکز کے طور پر استعمال کیا گیا ہے''۔

پہلی بات تو یہ کہ 9/11 کے واقعے میں جن 19 افراد کو ملوث قرار دیا جاتا ہے، ان میں سے 15 کا تعلق سعودی عرب سے بیان کیا جاتا ہے، باقی کا اردن اور یمن سے۔ پاکستان یا افغانستان سے کوئی فرد اس فہرست میں شامل نہیں ہے۔ اس کے باوجود سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پاکستان کا ذکر اس میں کیوں آیا، پھر اس رپورٹ میں پاکستانی مدارس کا دہشت گردی اور انتہا پسندی کے مراکز کے طور پر ذکر کیوں کیا گیا۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ 9/11 کمیشن کی رپورٹ میں سعودی عرب کا ذکر 90 مرتبہ، عراق کا 100 مرتبہ، پاکستان کا 150 مرتبہ اور افغانستان کا ذکر 200 مرتبہ آیا ہے۔ دوسری بات یہ کہ مدارس کے صرف اسی قدر ذکر پر اکتفا نہیں کیا گیا، بلکہ آگے چل کر اس رپورٹ کے صفحہ 374 پر اس وقت کے سیکرٹری دفاع رونلڈ رمزفیلڈ کے ایک بیان کا حوالہ دیا گیا ہے جو اس نے 2003ء میں دیا تھا۔ اس بیان میں سیکرٹری دفاع نے سوالیہ انداز میں یہ کہا کہ کیا امریکی حکومت اور فوج اس تعداد میں دہشت گردوں کو گرفتار، ہلاک یا کارروائیوں سے روکنے میں کامیاب ہو رہی ہے جس تعداد میں مدرسے یا انتہا پسند علماء انہیں بھرتی کے بعد تربیت دے کر امریکہ کے خلاف جنگ کے لئے تیار کر رہے ہیں۔ اپنے

سوال کا خود ہی جواب دیتے ہوئے رونلڈ رمزفیلڈ پھر کہتا ہے کہ اگرچہ امریکی حکومت ایک طرف تو لمبی منصوبہ بندی اور مربوط حکمت عملی کی تیاری کررہی ہے، جبکہ دوسری طرف دہشت گردوں کی آئندہ نسل کے خاتمے کے لئے قلیل المدت حکمت عملی کے تحت فوجی کارروائیاں بھی جاری رکھے ہوئے ہے۔

جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے، مدارس کے خلاف فضاء ہموار کرنے کے لئے بے جا پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے اور غیر ملکی ذرائع ابلاغ کے ساتھ ساتھ ملکی نشریاتی ادارے بھی اس مہم میں برابر کے شریک ہیں۔ طوالت سے بچنے کے لئے یہاں صرف چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔ ستمبر 2013ء میں تمام ملکی اخبارات میں مدارس کے حوالے سے ایک خبر بڑے اہتمام سے شائع کی گئی۔ خبر کے مطابق حکومت پنجاب نے ملک بھر میں پھیلے دس ہزار سے زیادہ مدارس کی کڑی نگرانی کا فیصلہ کیا اور ان کی مکمل جانچ پڑتال کے ساتھ ساتھ ان کے ذرائع آمدنی کا جائزہ لینے کا فیصلہ کیا گیا۔ خبر کے مطابق 45 مدارس کو انتہائی خطرناک قرار دیا گیا، جن میں سے بیشتر ملتان شہر میں تھے، جبکہ کچھ لاہور میں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک سال سے زیادہ عرصہ گزرنے کے باوجود ایسے مدارس کی نشاندہی اور ان کے خلاف کارروائی کیوں نہیں کی گئی جو انتہاپسندی اور دہشت گردی کی سرگرمیوں میں ملوث ہیں۔ اس کے کچھ ہی دنوں بعد ایک نجی چینل پر ایک دانشور یہ دعویٰ کرتے ہوئے پائے گئے کہ ضلع بہاولپور اور ضلع بہاولنگر میں بعض مدارس کو دہشت گردی کی تعلیم تربیت دیتے ہوئے خود اپنی آنکھ سے دیکھا ہے۔ واضح رہے کہ یہ دانشور انہی دنوں بھارت یاترا سے واپس آئے تھے۔ اب بہاولپور یا بہاولنگر نہ تو جنگلی علاقے میں واقع ہیں اور نہ ہی دور دراز کے پہاڑی علاقے میں جہاں ہماری پولیس یا دیگر اداروں کی رسائی ممکن نہ ہو۔

اس کے بعد مئی 2014ء میں ایسی ہی خبر دوبارہ اخبارات کی زینت بنی۔ اس بار امریکی محکمہ داخلہ کی ایک رپورٹ کے حوالے سے یہ دعویٰ کیا گیا کہ بلوچستان اور قبائلی علاقوں میں موجود کئی مدارس دہشت گردی میں ملوث ہیں۔ یہ خبر بنیادی طور پر ایک جرمن اخبار نے شائع کی تھی جسے ہمارے اخبارات، بالخصوص انگریزی اخبارات نے بڑے اہتمام سے شائع کیا۔ اتفاق سے امریکی محکمہ داخلہ کی مذکورہ رپورٹ انٹرنیٹ پر موجود ہے اور اس میں مدارس کا قطعاً کوئی ذکر نہیں ہے۔ ہمارے ملکی اخبارات نے مدارس کا اضافہ کرکے صحافتی بدیانتی کا مظاہرہ کیا۔ اس سے بھی بڑی بدیانتی کا مظاہرہ ایک پاکستانی نژاد امریکی مصنف نے کیا، جس نے پاکستان کے مدارس پر ایک کتاب لکھی، اس مصنف نے ضلع بہاولپور کی تحصیل احمد پور شرقیہ میں موجود مدارس کا خصوصی طور پر ذکر کیا ہے۔ احمد پور شرقیہ میں موجود مدارس کے حوالے سے مصنف نے لکھا ہے کہ اس تحصیل میں 367 مدارس ہیں، ان میں سے تقریباً پچاس فیصد دہشت گردی کی کارروائیوں میں ملوث ہیں، جن کا ریکارڈ متعلقہ تھانے میں موجود ہے۔

اتفاق سے راقم کا تعلق بھی اسی علاقے سے ہے، مصنف کی کتاب پڑھ کر میں سوچ میں پڑ گیا کہ اگر ایک تحصیل میں

ساڑھے تین سو سے زیادہ مدارس موجود ہیں تو پورے ضلع بہاولپور میں جس کی چار تحصیلیں ہیں، کل مدارس کی تعداد ساڑھے چودہ سو بنتی ہے، اسی طرح پورے پنجاب میں مدارس کی تعداد پچاس ہزار سے تجاوز کر جائے گی۔ باقی تینوں صوبوں آزاد کشمیر اور گلگت کو ملا کر پاکستان میں مدارس کی تعداد محتاط اندازے کے مطابق بھی ڈیڑھ لاکھ تو پہنچ ہی جائے گی، چنانچہ راقم نے اپنے پی ایچ ڈی کے سات طلباء کے ساتھ اس تحصیل کا سروے کیا، پوری تحصیل میں گلی گلی، محلہ اور بستی بستی کا جائزہ لیا اور تمام علاقے میں موجود تمام مساجد اور مدارس کا محل وقوع، طول بلد اور عرض بلد کے ساتھ نوٹ کیا تا کہ نقشے پر اس کی نشاندہی کی جاسکے۔ قارئین حیران ہوں گے کہ اس طرح ہم نے 355 مساجد کا شمار کیا جن میں سے صرف 41 میں مدارس قائم تھے، دراصل مصنف مسجد، مکتب اور مدرسے میں فرق کرنے سے قاصر رہا، یاد رہے کہ ان 41 مدارس میں سے صرف 7 میں درس نظامی کی تدریس آدھے سے زیادہ نصاب پر جاری تھی، باقی میں صرف ابتدائی دو تین سال کی تعلیم دی جاتی تھی، اس کے بعد ہم نے متعلقہ تھانے سے رابطہ کیا اور تھانے کے سربراہ سے تحریری تصدیق حاصل کی جس کے مطابق کوئی بھی مدرسہ یا مدرسے کے استاد دہشت گردی میں ملوث نہ تھے، اگرچہ علاقے میں شیعہ، سنی فرقے کے افراد میں جھگڑے کے واقعات درج تھے، لیکن اس میں مدارس ملوث نہ تھے یا ان کے خلاف تھانے میں کوئی مقدمہ درج نہ تھا۔

درج بالا واقعات سے مدارس کے خلاف جاری مہم کی اصل حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نہ صرف برصغیر میں بلکہ دنیا بھر میں پھیلے ہوئے مدارس صدیوں سے تعلیمی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ ان مدارس کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنی خود مذہب اسلام کی۔ برصغیر میں ان مدارس کی تاریخ کم از کم بارہ سو سال پرانی ہے۔ مدارس کی اہمیت اور ضرورت کا اندازہ علامہ اقبالؒ کے اس بیان سے لگایا جاسکتا ہے جس کا ذکر خلیفہ عبدالحکیم مرحوم نے اپنی ایک تحریر میں کیا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے کہا کہ پہلے میں بھی مدارس کو مروجہ اسکولوں میں ضم کرنے کا حامی تھا، لیکن جب میں یورپ گیا تو مجھے مدارس کی ضرورت اور اہمیت کا اندازہ ہوا، کیا آپ سوچ سکتے ہیں کہ اگر مدارس نہ رہے تو مسلم معاشرے کا کیا حشر ہوگا۔ اس کا وہی حشر ہوگا جو اسلامی تہذیب اور معاشرے کا اسپین میں ہوا، جہاں بعض مساجد تو موجود ہیں لیکن ان میں نمازی نہیں، اس لئے ان مدارس کو جوں کا توں رہنے دیا جائے۔ لیکن یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مدارس کے خلاف مہم کیوں جاری ہے اور اس میں حالیہ اضافہ کیوں دیکھنے میں آرہا ہے، کہیں ایسا تو نہیں کہ رونلڈ رمز فیلڈ کے اعلان کے مطابق یہ کسی لمبی منصوبہ بندی کا حصہ ہے، یا پھر کہیں کمال اتاترک کے زمانے کی ترکی کی تاریخ دہرانا تو مقصود نہیں ہے، جہاں تمام مدارس کو مارکیٹ میں تبدیل کر دیا گیا اور مساجد میں عربی میں اذان پر پابندی لگادی گئی۔ اس کی تفصیل پھر سہی۔

☆☆☆